# تاریخ و تہذیب، مغائرت اور اردو ادب کا باہمی رشتہ

(Interrelationship of History, Civilisation, Unconformity & Urdu Literature)

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2023.07041985

ڈاکٹر رحمت علی شادؔ

Dr. Rahmat Ali Shad

Principle, Govt. Associate College Kameer Town Sahiwal

**Abstract:**

*History took its origin from tales and fables. Then, every passing moment of time rendered maturity to human experience and it blessed the consciousness of man with light. Man, since the birth of the world till present era, has been passing through various ages. Man has covered the different stages of progress with unique culture and civilisation of his time. Thus, he has been gathering wisdom and powerful sensibilty on his eternal journey. The study of culture and civilisation includes man's living customs and traditions, philosophy and ideas, various sciences, principles of politics and economics, language and literature, tales and folklores, rites and religions etc. Culture and civilisation has lasting impression on literature of every age. The root cause of moral barrenness and crisis of our character is our indifference from history and disharmony with our culture.*

**Keywords:**

*History & Culture, Civilization, Urdu Literature, Customs & Traditions, Folklores, Literature & Culture, Literary Trends.*

تاریخ کی ابتدا قصے کہانیوں سے ہوئی تھی اس لیے تاریخ محض چند من گھڑت قصوں، بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کے حالات و واقعات کو ہی تاریخ سمجھا جاتا تھا لیکن اب تاریخ محض قصے کہانیوں کی رنگین داستان نہیں ہے بلکہ وقت کے ہر لمحے نے تجربے کو پختگی اور شعور کی روشنی عطا کی اور انسان نے ان قصے کہانیوں کو عقلی و تنقیدی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا؛ جو باتیں اس کے معیار پر پوری اتریں وہ تاریخ کا حصہ بن گئیں؛ بے معنی اور فضول تفصیلات کو نظرانداز کر دیا گیا اس طرح تاریخ کو انسانی زندگی کے اہم واقعات وحقائق کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ماضی ہمارے لیے منارۂ نور کی مانند ہے۔ تاریخ ہی کے اوراق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ

وحشت کے دور سے نکل کر انسان نے اپنی دنیا پر قدرت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کی تھیں۔ اس کوشش اور جہدوجہد میں اسے دشواریوں اور صعوبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی عزم کے سامنے راستے کا ہر پتھر اور رکاوٹ ختم ہو گئی اور آج اسی ذہنی ارتقا کی بدولت ہم انسانوں کو جو ابتدا میں غاروں میں رہا کرتا تھا اور جسے اپنا تن ڈھانپنے کے لیے درختوں کے پتوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاریخ کے زمانے کے آغاز سے پہلے ہی انسان غیر مہذب سے مہذب حالت میں داخل ہو چکا تھا۔ پتھر کے زمانے سے دھات کے زمانے تک ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جو تہذیب کی نشو نما کے لیے ضروری تھے۔ پتھر کے زمانے سے ایٹم بم کے زمانے تک انسان مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن رہا ہے اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان آئندہ بھی ترقی کرتا رہے گا اور اس طرح تہذیبیں پنپتی رہیں گی اور تاریخ بنتی رہے گی۔ قوموں کو مہذب بنانے میں مذہب اور فنِ تحریر نے بھی حصہ لیا۔ مذہب اور فنِ تحریر میں ارتقائی عمل مسلسل جاری رہا اور اس طرح معاشرتی ترتیب سے تہذیب اور ثقافتی تخلیق کو فروغ ملا اس حوالے سے ول ڈیوراں رقم طراز ہیں:

> "تہذیب وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافتی تخلیق کو فروغ دیتی ہے۔ چار عناصر مل کر تہذیب کو متشکل کرتے ہیں۔ معاشی بہم رسانی، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علم و فن کی جستجو۔" (۱)

تاریخ مشاہدے کی وسعت، تجربات کی پختگی اور احساس و شعور کو نئی سمتوں سے آشنا کرتی ہے۔ تاریخ روایات کہن اور نقوشِ پارینہ کا ہی خزینہ نہیں بلکہ ہماری ذہنی و فکری، جذباتی و تہذیبی اور معاشرتی و ثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے اور اگر فکر و عمل پر تاریخی و تہذیبی روایات کی گرفت کمزور پڑ جائے تو بے یقینی اور انتشار سے سفر زیست سست روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ آج ہمارے کردار اور شخصیت میں جو پسپائیت، بحران اور تضاد نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ ماضی سے بیزاری، تاریخ سے غفلت، ثقافت سے مغائرت، بیگانگی اور تصورِ حقیقت سے دوری ہے یہی وجہ ہے کہ ہم میں تخلیقی اور حقیقی ذوق کمزور پڑ گیا ہے۔ طرزِ زندگی میں لوگوں کا رہن سہن، فکر و فلسفہ، علوم و فنون، اصولِ معیشت و سیاست، شعر و نغمہ، رسوم و عقائد اور زبان و ادب سبھی کچھ شامل ہے اور یوں یہ تعریف نہ صرف تہذیب بلکہ تمدن و ثقافت پر بھی محیط ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تہذیب، ثقافت اور کلچر میں کچھ اس طرح حدِ فاصل کھینچتے ہیں:

> "لفظ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرزِ عمل کے اس اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں اور لفظ ثقافت کا زور ذہنی صفات

پر ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے مجموعے کو کلچر کہیں گے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں۔"(۲)

بنی نوع انسان کی زندگی کے سفر کے ارتقا کی کہانی بہت قدیم اور طویل ہے کیوں کہ تلاش و جستجو انسانی فطرت کا خا صہ ہیں اسی لیے ماہرین بشریات اس تلاش و جستجو میں ہمیشہ سے سرگرداں رہے ہیں اورجب انسان اپنی جبلت سے مجبور ہوکر جن حقائق سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہو تا ہے وہی حقائق انسان کی ارتقائی وثقافتی تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔انسان کی معاشرتی اورمعاشی ترقیاں اس کی تہذیب وثقافت کی کہانیاں،اس کے علوم اورمذاہب کے کارواں اور خود اس کے عروج وزوال کے واقعات تاریخ کے ذریعے ہی ہم تک پہنچے ہیں اسی لیے تاریخ کامطالعہ ہمیں انسان کی اس جدوجہد سے روشناس کراتاہے جو اس نے زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کراب تک کی ہے۔

ہر وہ واقعہ جو اپنی اہمیت کی بدولت ناقابلِ فراموش بن جائے تاریخ کی میراث بن جاتا ہے۔تاریخ میں نہ صرف واقعاتِ گزشتہ ہوتے ہیں بل کہ تاریخ حال اورمستقبل کے لیے آئینہ بھی ہے کہ ہرحال اورمستقبل کا ماضی میں تبدیل ہو کر تاریخ کی میراث بن جانا ایک لازمی امر ہے اورتہذیب کی میراث ایک نسل سے دوسری نسل میں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہونافطری عمل ہے تہذیب کے قافلے کا یہ سفر تاریخ کاموضوع ہے۔کہانیوں اورافسانوں سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز تہذیب کی تاریخ افراد یا بادشاہوں کی تاریخ نہیں بل کہ پوری انسانیت کی تاریخ ہے۔ایک قوم کا زوال دوسری قوم کے عروج کا باعث بنااور ایک سلطنت کا انحطاط دوسری سلطنت کی ترقی کا سبب بنا۔تہذیب کا یہ قافلہ چلتا رہا اور اب تک چل رہا ہے۔برِعظیم بالکل ابتدائی زمانے سے دینی اور اخلاقی تصورات کی آماج گاہ اور مختلف تہذیبوں کی کشمکش کا میدان رہاہے۔یہاں کئی تہذیبیں تکمیل کو پہنچ کر زوال پا چکی ہیں،یہاں ایسی سلطنتیں بھی قائم رہ چکی ہیں جن کی شہرت اور اثر مشرقی اور مغربی ایشیا میں دوردور تک تھا اور دوسری طرف یہاں صدیوں تک ایسی بد نظمی بھی رہی ہے کہ ایک دنیا اس پرمتعجب تھی کہ یہاں عروج وزوال، تنظیم وانتشار کے امکانات جیسے کہ پہلے تھے اب بھی موجود ہیں۔رابرٹ بریفالٹ نے تہذیبی نشوو نما، عروج وزوال کو سیاست،بربریت اورتہذیبی اشتراک واستفاد سے منسلک کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کوئی سا مہذب ترین معاشرہ بھی دوسرے مہذب معاشروں سے آزادانہ ومتواترارتباط کے بغیرنشوونما نہیں جاری رکھ سکتا۔ہر عظیم تہذیب خواہ وہ یونانی ہو یا رومی،عربی ہو یا یورپی،جتنی وسیع ہوتی گئی اسی قدر زیادہ مفید اور قابل قدر

ہوتی گئی نیز جس تہذیب میں کہولت، انحطاط، بدعنوانی اور زوال وتباہی کا میلان پایا جائے اس کا مطلب یہی ہے کہ اس میں دروغ گوئی اوربد دیانتی راہ پاگئی ہے اورتہذیب کے پھیلاؤ کی جگہ جھوٹ،منافقت اورکرپشن اس کی بقا کے لیے اصل خطرہ ہے۔"(۳)

برعظیم میں جس طرح مختلف ادوار میں مختلف حکمران آتے رہے بعینہٖ مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں بھی ان علاقوں کاحصہ رہی ہیں۔برِعظیم ہمیشہ سے کسی ایک تہذیب کے بجائے مختلف تہذیبوں کی آماج گاہ رہاہے جب کہ یہ تہذیبیں اسی خطے میں پنپتی اورارتقائی سفرکرتی رہیں ہرتہذیب دوسری تہذیب پر نہ صرف اثراندازہوتی رہی ہے بل کہ متاثر ہونے کاعمل بھی برابر جاری رہا ہے۔برعظیم میں یہ تہذیبی تسلسل قرنوں سےجاری ہے اس لیے برعظیم کی سر زمین مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کاایسا مجموعہ رہاہے جس میں ہر تہذیب اپنی روایات و اقدار کے ساتھ نظر آتی ہے۔فطری تغیرات اور تبدیلیوں کی بدولت تہذیبوں کی اشکال بنتی اور بگڑتی رہی ہیں اور ان کے اندر شکست وریخت کاعمل بھی ہمیشہ سے جاری رہاہے۔تہذیبی ٹوٹ پھوٹ اور تبدیلیوں کے باوجود ہرتہذیب نے اپنی زندگی اوربقا کے لیے ہرممکن کوشش کی ہے اسی وجہ سے بعض تہذیبوں کے خدوخال اور نقوش مٹنے کے بعد بھی ان کا وجود کسی نہ کسی شکل میں برقرار رہا ہے۔

برعظیم میں مختلف تہذیبوں کے ملاپ سے ایک اجتماعی اور ملی جلی تہذیب کے نقوش بھی ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ برعظیم کی تہذیب ایک ہی وقت میں ہندوتہذیب،مسلم تہذیب،مغربی تہذیب،بدھ مت، زرتشت،جین مت،انگریزی اینگلوانڈین اور کئی دیگر تہذیبوں کے میلانات ورجحانات کی عکاس ہے۔

برعظیم ہزاروں سالہ پرانی تہذیب وثقافت کی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اب ہم سب پہلے ہندی تہذیب کے متعلق آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ہندی تہذیب کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے تمام مہاجر تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔برعظیم کی تہذیب نے مختلف ادوار میں نووارد تہذیبوں کو اس طرح اپنے اندرسمولیا کہ وہ اپنی حقیقی شناخت کھو بیٹھیں بل کہ ان نووارد تہذیبوں کی آمیزش سے اس کااپنا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا بیرونی تہذیبیں جوروایات واقداراورتہذیب وثقافت لے کر آئیں ان روایات واقدار،تہذیب و ثقافت اورنئے رجحانات و میلانات کو برعظیم کی تہذیب نے نہ صرف اپنایا بلکہ یہ تہذیب تبدیلیوں اور تغیرات سے دوچار بھی ہوئی اور اس میں جدیدیت کے رجحانات بھی پیدا ہوئے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں برعظیم میں مسلم تہذیب کے حوالے سے تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ مسلمان فاتحین اور تاجروں کی رفتہ رفتہ آمد کے بعد محمد بن قاسم نے دیبل سے ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا

اس طرح علاقے میں اسلام کی آمد ہوئی۔مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں ہندو راجہ کی حکومت تھی۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس خطہ زمین پر ایک نئی ثقافت کا دور شروع ہوا۔ بھمبھوراور منصورہ کے شہروں سے مسجد کے آثار کے علاوہ عرب دور کے کچھ سکے بھی ملے ہیں۔اس عہد میں فنِ تعمیر،مصوری،خطاطی اور موسیقی کے فن کو ترقی ملی۔اس خطہ زمین پر مسلم تہذیب جس کی بنیاد محمد بن قاسم نے رکھی،مختلف حکمران خاندانوں غزنوی،غوری،خلجی،تغلق،سادات،سید،لودھی اورمغلوں سے ہوتی ہوئی ہمارے ثقافتی ورثے کی صورت میں ہم تک پہنچی اورآج ہم اسے اپنی"ثقافتی تاریخ" کہتے ہیں۔اسلامی ثقافت، اختلاف واتحاد کی جامع ہے۔بنیادی اتحاداور فروعی اختلاف دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اسلامی ثقافت ہر وہ ثقافت ہے جو (دوسری ثقافتوں سے بعض باتوں میں متحد ہونے کے باوجود)دوسری قوم سے ممتازکردے۔اسلامی ثقافت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ"الف"سے لے کر"ے" تک ہر بات میں غیر مسلم کلچر سے جداہوکچھ چیزیں مشترک ہوں گی اور کچھ جُدا،ہر کلچر کی یہی صورت ہوگی۔اس سلسلہ میں مولانا شاہ محمد جعفر ندوی لکھتے ہیں:

> "ہر ثقافت کا خالق کوئی خاص تصور ہوتاہے۔اسلامی کلچر کے پسِ پردہ بھی ایک عقیدہ وتصور ہے اور وہ ہے خدا پرستی یا لاَاِالہَ اِلا اللہ پر ایمان۔اس تصور کی جڑ سے جو شاخ بھی نکلے گی وہ عین اسلامی ثقافت کی حامل ہو گی خواہ کسی دوسری ثقافت کی شاخ سے ہم شکل ہی کیوں نہ ہو۔"(۴)

برِعظیم میں مسلمانوں کی زندگی نہ صرف مسلسل تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہی ہے بلکہ اسلامی تہذیب کے اثرات بھی دیگر مذاہب اور ان کے ماننے والوں نے بہت حد تک قبول کیے جس سے ایثار،قربانی اور رواداری کے جذبات اور احساسات کو تقویت حاصل ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ بر عظیم میں رہنے والے لوگوں کے فکروخیال اور فہم وفراست میں بھی وسعت پیداہوئی۔جہالت اور تاریکی کم ہوتی چلی گئی۔برِعظیم میں جیسے جیسے مسلم تہذیب کا ارتقا ہو تاچلاگیا یہ اپنی نمایاں خصوصیات سے دیگر تہذیبوں سے منفرد اور ممتاز ہوتی چلی گئی اور لوگوں پر اس کی بنیادی خصو صیات اوراصول و ضوابط بھی عیاں ہوتے چلے گئے،اس طرح اس تہذیب میں دیگر مختلف مذاہب سے وابستہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد شامل ہوتی چلی گئی۔ان لوگوں نے اپنے اپنے مذاہب سے دوری اختیار کر کے اسلام کی ابدی اقدار کواپنانے میں عافیت سمجھی۔مسلم تہذیب کے احیا سے برہمنوں کی اجارہ داری بُری طرح مجروح ہوئی اورمساوات کا نظام رائج ہوگیا۔لوگوں کو برابری کی سطح پر سوچنے اورزندہ رہنے کا حق حاصل ہوا اورہر طرح کے نسلی اورمعاشرتی امتیازات مٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔برعظیم کی تہذیب پر ہندومت کے اثرات صدیوں سے غالب تھے اور

معاشرتی سطح پر سماج کئی طبقات میں بٹاہوا تھا لیکن مسلم تہذیب کی آمد سے یہ طبقاتی تقسیم کافی حد تک مٹ گئی۔ برہمن معاشی، معاشرتی، اور سیاسی اور مذہبی حوالے سے زندگی کے ہر معاملے میں دوسرے طبقوں پر حاوی تھا اور اس کا کہنا حکم کے زمرے میں آتا تھا جب کہ ہندو معاشرے میں شودر کو حقیر، گھٹیا، اور ذلیل سمجھا جاتا تھا اس کی زندگی محض دوسروں کی خدمت کے گرد گھومتی تھی۔ دوسری ذاتوں کی خدمت کے علاوہ اس کی کوئی اپنی پہچان اور تشخص نہ تھا حتیٰ کہ وہ دیگر مذاہب کی مذہبی کتب نہ تو پڑھ سکتا تھا نہ ہی سن سکتا تھا۔ محمد مجیب کے مطابق:

> "شودر کا دھرم یہ تھا کہ تینوں اونچی ذات کے لوگوں کی ہر طرح سے خدمت کرے۔ وہ دینی کتابوں کو پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی سن سکتے تھے۔"(۵)

جیسے جیسے اس اکثریتی طبقے کا استحصال جاری رہا ان کے ذہنوں میں نفرت کا احساس پروان چڑھتا گیا۔ اس کی نفرت کی بدولت ہندوستان کی تہذیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔ برِعظیم میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد زندگی کے تمام شعبوں میں مساوات، بھائی چارہ انصاف اور رواداری جیسی صفات قائم ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کا یہ پسا ہوا اور اکثریتی طبقہ مسلم تہذیب کی طرف مائل ہونے لگا اور اس کا سہرا مسلمان صوفیا کو جاتا ہے۔ ہر دور میں دو طبقات ہمیشہ سے رہے ہیں جن میں ایک طبقہ بادشاہوں کا ہے جس کا تعلق خواص کے ساتھ رہا ہے اور دوسرا طبقہ صوفیا کا ہے جس کا تعلق عوام کے ساتھ رہا ہے اور ان کے مفادات عوام کے ساتھ وابسطہ تھے۔ وہ عوامی ثقافت کے محافظ تھے؛ طبقاتی نظام اور اونچ نیچ کے مخالف تھے؛ سادگی پسند تھے؛ مساوات کے قائل تھے؛ انسان دوستی کا درس دیتے تھے؛ حاکم و محکوم کی تقسیم ختم کرنا چاہتے تھے اور سب کے لیے یکساں انصاف کے طالب تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دن بہ دن وہ حکمران طبقوں سے کٹ کر عوام کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی بتاتے ہیں:

> "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کرنے والوں میں صوفی اپنی مرتاضانہ تربیت کے باعث عالم اور فقیہ کے مقابلے میں عوام الناس کے زیادہ قریب تھا کیوں کہ مؤخرالذکر با لعموم محبت اور کردار سے عاری ہوتا تھا اور اس میں گہرے روحانی احساس کا بھی فقدان ہوتا تھا۔ صوفی ہر شہر قصبہ اور گاؤں میں اپنے ارد گرد اپنے مریدوں کا ایک حلقہ قائم کر لیتا تھا اور اس کے بیرونی حلقۂ ادارت میں غیر مسلم اور خاص طور پر اچھوت ذات کے ہندو شامل ہوتے تھے۔"(۶)

مسلمان صوفیا نے ایسے مراکز قائم کیے جہاں سے اسلام برعظیم کے مختلف علاقوں میں پھیلا۔ ان کی

اپنی مجالس اورخانقاہیں تھیں جو درس وتدریس کے ساتھ شریعت وطریقت کی روحانی منازل طے کرانے کی تربیت گاہیں تھیں۔ دراصل یہی وہ بزرگ تھے جنھوں نے عملی طور پر برعظیم پاک و ہند کے گوشے گوشے میں تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا اور ایسے مقامات پرجہاں شاہی لشکراور حکومتوں کے قدم بھی نہیں پہنچے تھے وہاں یہ پیغام پہنچایا۔ سلاطین اورامرا کی حکومتیں تو ریاستوں اورعلاقوں پر تھیں اورانقلابِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی تھیں لیکن صوفیا کی حکومت لوگوں کے دلوں پر تھی اورزمانے کی کوئی گردش ان کی حکومت پر اثرانداز نہیں ہوتی تھی۔ صوفیا نے اپنے روحانی دربار لگائے جن کا مقابلہ سلطانی درباروں سے تھا۔ مخلوق دنیا دار حکمرانوں کے حرص و تکبر سے پریشان ہوتی تو روحانی درباروں میں حاضر ہو کر زندگی کی اچھائی کا احساس بحال کرتی۔

مسلم تہذیب کے ہمہ گیر پہلوؤں نے برِعظیم کے ہرحلقے کو متاثر کیا۔ اسلام کے عدم تعصب، عدل اورروادای جیسے زریں اصولوں نے تمام طبقوں کے باشندوں کو جینے کا حق دیا اور کسی سے بھی امتیازی سلوک روا نہ رکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب پھلنے پھولنے لگی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا وقت آیا کہ برِعظیم میں مسلم تہذیب بھی اندرونی اور بیرونی یورشوں کی بدولت شکست وریخت سے دوچار ہوئی اوراس طرح ہندوستان میں امن اورشانتی غارت ہوتی چلی گئی۔ مسلم تہذیب کی بہت سی اقداروروایات کو پامال کیا گیا اور اس کے نقوش بری طرح مسخ کیے گئے جہاں مسلم تہذیب نے ہندو تہذیب پراثرات چھوڑے وہاں ہندو تہذیب نے بھی مسلم تہذیب کو متاثر کیا اس طرح ایک مشترکہ تہذیب کے خدوخال نمایاں ہوئے۔ یہ ہندومسلم تہذیب جومختلف خصوصیات کا مرقع بن گئی، زندگی کے ہرشعبے پرغالب آتی گئی۔ اس بارے میں صباح الدین عبدالرحمن لکھتے ہیں:

> ”مسلم تہذیب نے جہاں ہندو مت تہذیب پراثرات چھوڑے وہاں خود مسلم تہذیب نے کسی حد تک ہندومت تہذیب کے اثرات کو قبول کیا۔“(۷)

ہندی، مسلم تہذیب کے باہمی ملاپ سے ایک مشترکہ ہندی، مسلم تہذیب کا آمیزہ تیار ہوا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی اورہندوؤں نے مسلمانوں کی بہت سی روایات، اقدار، طرزِزندگی اوررسوم ورواج کواپنا لیا۔ اس بارے میں ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

> ”اوردیپالی نےخود اپنے گاؤں میمن سنگھ میں دیکھا کہ برہمادتیہ فقیر جو مسلمان تھے منتر پڑھ کر اور گھنٹیاں بجا بجا کر مسلمان کسانوں کی مرادیں پوری کرنے کا تپ کرتے تھے اورمسلمان کسانوں کے ہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی وجے

کی رسم ادا کی جاتی ہے۔"(۸)

ہندی تہذیب نے دیگر بہت سی مختلف تہذیبوں کو نہ صرف اپنے اندر سمویا بل کہ مسلم تہذیب کے اثرات کو بھی پوری طرح اپنے اندر جذب کیا، یہاں تک کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد نے مسلم تہذیب کی روایات و اقدار کو اپنی زندگی کا ایک لازمی عنصر بنا لیا۔ جہاں مسلم تہذیب تھی وہاں ہندی تہذیب کے اثرات بھی گہرے تھے جو آج بھی ہمارے معاشرے میں کہیں کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہندی، مسلم تہذیب کے اشتراک سے جو فطری آمیزہ وجود میں آیا وہ نہ تو بالکل اسلامی تھا اور نہ ہی ہندی بلکہ دونوں تہذیبوں کی آمیزش سے مشترک چیزیں وجود میں آئیں اور یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ شہزاد حسین کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> "ہندواور مسلمانوں میں سماجی طور پر کوئی فرق نہ تھا خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنتیں اودھ کے بہت پرانے خاندانوں کی بیگمات اب تک لہنگے پہنتی ہیں۔ بن بیاہی لڑکیاں دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں۔"(۹)

تاہم برعظیم میں ہندی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی بہت سی ثقافتی اقداراور رسوم ورواج کو اپنایا۔ اس طرح ہنداسلامی تہذیب کے نقوش اُبھر کر سامنے آئے اور مسلمانوں کی تہذیب غالب ہونے کے باوجود مقامی تہذیب سے دامن نہ بچا سکی۔ اس وقت برعظیم میں ایک ایسی تہذیب موجود تھی جس کی اپنی مخصوص روایا ت واقدار تھیں جو پورے برعظیم کے لوگوں کے پہچان تھیں اور لاکھوں لوگ اس مخصوص تہذیب اور کلچر سے جڑے چلے آ رہے تھے۔ یہ مخصوص انداز سے اپنا تہذیبی ارتقا جاری رکھے ہوئے تھی اور اس میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں جو ایک مخصوص تہذیب کے پھیلاؤ اور ترقی کی غماز تھیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی صورت حال بالکل بدل کر رہ گئی۔ ایک نئی تہذیب، جو مغربی میلانات، روایات اور رجحانات لیے ہوئے تھی برِعظیم پر چھا گئی۔ مقامی مسلم تہذیب کی شدید شکست و ریخت کی بدولت ہی انگریزی تہذیب کو پنپنے کا موقع ملا۔ انگریزچوں کہ حاکم تھا اپنی تہذیب کو فروغ دینا اس کے لیے مشکل نہ تھا اور تھوڑے ہی دنوں بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنی تہذیب و تمدن سے بیگانگی ظاہر کرتے ہوئے انگریزی تہذیب وتمدن کا دلدادہ بن گیا۔ یہ گروہ مادر پدر آزاد ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور کلبوں کی رونقوں کو دوبالا کرنے لگا۔ دن رات اور مشرقی اقداروروایات کی

پرواہ کیے بغیر انگریزوں کا ہمنوا اور مغربی تہذیب کا دلدادہ نظر آنے لگا۔اس آزاد خیال طبقے نے ہندو مسلم کلچر کو خاصا متاثر کیا اسی خاص طبقے کی دیکھا دیکھی عام مسلمانوں اور ہندوؤں میں بھی آزاد روی کا عنصر پروان چڑھنے لگا۔قدیم ہندو مسلم تہذیب اورمغربی تہذیب کی آمیزش سے نئی ثقافت ابھری لیکن قدیم اور جدید قدروں کے ساتھ ساتھ مذہبی منافرت سے اس ثقافت کو نقصان پہنچا۔ایڈورڈ مائیکل کہتے ہیں:

"انگریزوں کے احساسِ برتری اور پادریوں کی مذہبی منافرت سے نئی ثقافت کو نقصان پہنچا۔"(۱۰)

جب ہندمسلم اور انگریزی تہذیب کا باہم ٹکراؤ عمل میں آیا تو ہندوستان کی ثقافتی تہذیبی اقدار بری طرح متاثر ہوئیں اور لوگوں کی زندگی میں مغربیت کے اثرات آہستہ آہستہ راسخ ہوتے چلے گئے۔یہ طبقہ گویا اپنی کوئی پہچان اور تشخص نہیں رکھتا تھا کیوں کہ وہ اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی اقدار کے احساس سے بھی عاری تھا۔علاوہ ازیں اپنی روایات واقدار کی پامالی کے ساتھ ساتھ وہ انگریزوں اور ان کی تہذیبی اقدار کا ترجمان بن گیا۔

انگریزوں،مراعات یافتہ طبقوں اور مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں نے مسلم تہذیب کے نقوش بگاڑنے میں بنیادی کردارادا کیا۔برعظیم میں مسلمانوں کے اندر وہ بنیادی سوچ جو مسلم علوم کے حوالے سے تھی اور قدیم عرصے سے تھی اس پر کاری ضرب لگی۔اسلامی علوم کی جگہ مغربی علوم نے لے لی جو باہمی تضادات اوراختلافات کاباعث بنی۔اس سے مسلمانوں اورانگریزوں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی عربی فارسی اوردوسری بہت سی زبانیں جومسلم تہذیب و ثقافت کی عکاس اور مسلم تہذیب کی روایات واقدارکو نمایاں کرنے میں مددگار تھیں ان کو مدارس سے ختم کرکےانگریزی زبان کو لاگو کیا گیا۔انگریزوں کی مسلم کش سوچ اور ان کے تعصب نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔مسلمانوں سے کہیں بڑھ کر ہندوؤں کےایک بڑے طبقے نے مغرب کی اندھی تقلید میں انگریزی تہذیب وتمدن کواختیار کیا۔حکومتی مراعات ملنے پر یہ طبقہ ہرمعاملے میں انگریزوں کامعاون اور ہمنوابن گیا۔بعض لوگوں کاخیال تھا کہ مغربی تہذیب کے میلانات ورجحانات اور اقداروروایات کو اپنانے سے انگریز مہربان ہوجائے گا اورانھیں مراعات اور سہولتوں سے نوازدے گا لیکن ان کا یہ خیال،خیالِ محض نکلا اوریہ گمان سراسرغلط فہمی،کم عقلی اورکوتاہ بینی پر مشتمل تھا۔ انگریزوں نے اس مغرب زدہ طبقے پر کوئی توجہ نہ کی بلکہ اس نام نہاد اور مغربیت زدہ طبقے کو تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنایا۔

انگریزحکمرانوں نے ہندوستان میں مقامی عوام کے لیے فارسی زبان کے بجائے پہلے اردو، پھر ہندی

اور پھر انگریزی زبان کو رائج کیا۔ مدرسوں کی جگہ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کر دیں۔ قواعد و منطق اور فلسفہ والٰہیات کی جگہ سائنس لازمی قرار دی گئی، بادشاہت کے بجائے جمہوریت، ریلوے کا مؤثر نظام، آب پاشی کے لیے نہریں، سڑکیں، حکمرانی کے لیے قانون و آئین اور فوج کے لیے نئے منظم قواعد و ضوابط اور اصول دے دیے۔ نئے جاگیرداروں اور رہے سہے امرا نے انگریز سرکار کی قربت اور پیروی میں فخر محسوس کیا اور ان کے بچے علم کے حصول کے لیے علی گڑھ سے لے کر آکسفورڈ، کیمبرج اور میونخ تک جانے لگے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سماجی میل جول اور جنگِ عظیم کی پیدا کردہ کساد بازاری نے ایک نئے اینگلوانڈین طبقے کو جنم دیا جس کا مذہب کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اس طبقے میں ہندو مسلم دونوں طبقات شامل تھے، اس لیے اس طبقے نے معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی سطح پر ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے کہ ان سے سرِ مو انحراف ممکن نہیں۔

اینگلوانڈین طبقے کی بڑھتی ہوئی جدت اور مغربیت نے ہندوستان کے مقامی لوگوں کی سوچوں کے زاویے تک تبدیل کر دیئے۔ اس طبقے کی روشن خیالی جو مادر پدر آزادی تک پہنچ چکی تھی، نے لوگوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس طبقے کی زندگی مغربی روایات واقدار سے جڑی ہوئی تھی اور اس طبقے کا ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے تعلق نہ ہونے کے برابر تھا بل کہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ہندوستان کے مقامی باشندوں میں سے کئی ایک معاشی حالت کو زیادہ مستحکم بنانے کے لیے اپنے مذاہب چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہو گئے۔ عیسائیت قبول کرنے والے اس طبقے نے انگریزوں سے اپنے تعلقات استوار رکھنے کے لیے ان سے شادیاں کیں یہ طبقہ اینگلوانڈین کہلایا جس کی کوئی شناخت اور کوئی تشخص نہ تھا۔ اس طبقے میں ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔

اینگلو انڈین طبقے نے برِ عظیم پاک وہند کی اجتماعی تہذیب کا نقشہ بدل کے رکھ دیا۔ یہ طبقہ "کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا" کے مصداق نہ تو اس میں مشرقی تہذیب کا عکس جھلکتا تھا اور نہ ہی مغربی تہذیب اس کی پہچان بن سکی۔ نائٹ کلبوں، شراب وکباب اور ہوٹلوں میں رات دن گزارنے والا یہ طبقہ ہندوستانی لوگوں کی اکثریت کے لیے نا قابلِ قبول تھا۔ یہ طبقہ اگرچہ ہندوستان کی تہذیب ہی کا پروردہ تھا لیکن اس کی روایات مشرق سے بالکل مختلف تھیں۔ انگریزی تہذیب کی اندھا دھند تقلید نے ان کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس طبقے نے تو مشرقی روایات و اقدار کو روند کر رکھ دیا۔ اس بارے میں شمیم احمد کا کہنا ہے:

> "اگر ہم گہری نظر سے دیکھیں تو یہ طبقہ جہاں مغربی اقدار کے تحت اس کے
> فکری غلبے کا ثبوت مُہیا کرتا ہے تو وہاں اس بات کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ

آنے والا زمانہ مغربی تہذیب کی توسیع کا زمانہ ہو گا۔ان میں اکثر کا المیہ یہ ہے کہ
وہ مغرب کے بے روح اور بے جہت معاشرے میں کہیں کے نہیں رہتے۔"(۱۱)

مقامی ہندوستانی تہذیبیں زوال کا شکار ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی طرزِزندگی، جدید معاشرتی تبدیلیوں اور لباس کو مقامی طبقوں نے اختیار کر لیا۔ان مقامی طبقوں میں بہت سے مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے اسی لیے مسلمانوں کی اکثریت معتوب ٹھہری اور ان کی ذات کو ہمیشہ مشکوک سمجھا گیا۔

مشرقی تہذیب سے بالکل مختلف ایک نیا کلچر انٹر کمیونل شادیوں سے وجود میں آیا اس کی اپنی روایات اور میلانات تھے۔یہ ایک ایسا کلچر وجود میں ا چکا تھا جس میں بچوں کے نام جدید اور مبہم رکھے جاتے تھے؛جن کو مشرقی روایات اور مغربی اقدار میں سے کسی ایک کے کھاتے میں بھی نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔جو لوگ اس کلچر میں شامل تھے وہ ظاہری نمود و نمائش کے نمائندہ تھے۔انھیں اپنی شناخت اور تشخص کی کوئی فکر نہ تھی۔اس طبقے کی پہچان اور شناخت ایک نامکمل اور ادھورے کلچر کے حوالے سے سامنے آئی۔چاندنی بیگم میں "قرۃ العین حید ر نے ا س کلچر کے نمائندہ افراد کی شادیوں اور ناموں کے متعلق بتایا ہے:

"انٹر کمیونل شادیاں اگرچہ بہت اونچے طبقے میں ہو رہی تھیں تو فریقین کے ہم
رتبہ ماں باپ عموماً خاموش رہتے تھے۔بچوں کے نام مبہم قسم کے کبیر،
راہل، سمیر، مونا، سیما یا روسی نینا۔زویا، نٹاشا رکھے جاتے۔"(۱۲)

اینگلوانڈین طبقہ بغیر کسی تشخص کے ایک مخصوص کلچر اور مخصوص دور کی پیداوار تھا۔تہذیبی حوالے سے ایک کھوکھلا پن اور سطحیت اس طبقے کے اندر ہمیشہ موجود رہی۔وہ کلبوں اور ہوٹلوں کے رسیا اور خود فریبی کا شکار تھے۔اینگلوانڈین تہذیب کے مختلف پہلوؤں اور ان کی زندگی کے خدوخال کے متعلق اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"خواتین چاردیواری کے اندر سگریٹ پیتے ہوئے زندگیاں بتاتی تھیں، اب ان میں
آزادی آچلی تھی، سیاہ چادریں ترک کر کے انگریزی لباس میں سائیکلوں پر
گھومتی ہوئی وہ اینگلو انڈین معلوم ہوتی تھیں۔"(۱۳)

برِ عظیم میں اگرچہ انگریزی تہذیب سے تصادم سے مقامی تہذیبیں ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار ہوئیں لیکن کسی نہ کسی صورت میں ان تہذیبوں کا وجود برقرار رہا۔انگریز کا لایا ہوا تہذیبی ڈھانچہ کسی بھی لحاظ سے مستقبل بنیادوں پر استوار نہیں تھا بل کہ عارضی اور نا پائیدار تھا۔اس کے باوجود ا س مغربیت کے

اثرات دیرپا ثابت ہوئے بل کہ اگر یوں کہا جائے کہ انگریزی کلچر کی لائی ہوئی بہت سی روایات اوراقدارآج بھی برعظیم کے لوگوں کی زندگی کا حصہ چلی آرہی ہیں اور بعض لوگ ابھی تک بلا واسطہ اور بالواسطہ مغرب کی تہذیب اورروایات کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکے۔

وقت کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ مسلسل ارتقا پذیر رہی ہے۔انسانی ترقی کے ارتقا کا یہ سفر ہمیشہ آگے کی جانب بڑھتا ہی رہا ہے۔اس سفر کے اہم مدارج دراصل وسیع ہوتی ہوئی انسانی فکر کے مدارج ہیں۔ ۱۹۸۷ء کاانقلابِ فرانس رومانوی تحریک کے عروج کازمانہ تھا۔اس انقلاب کورومان پسندوں کا ثمر قرار دیا جاسکتا ہے۔ہندوستان میں رومانویت کی جڑیں بہت قدیم اورگہری ہیں۔ہندوستان کی کلچرل رومانویت اورجدید رومانویت میں فرق دراصل ہندوستان اوریورپ کے سیاسی،سماجی اورمعاشی نظاموں کافرق ہے۔جدیدرومانویت یورپ کے سرمایہ دارانہ کلچر کے ساتھ پروان چڑھی جب کہ ہندوستان کے رومانوی کلچر کی بنیادیں مخصوص برہمنی کلچر میں موجود چھوت چھات اورذات پات کے نظام کے زیراثر پروان چڑھیں،گویا ہندوستان اوریورپ کی رومانویت میں بنیادی فرق یہ رہا تھا کہ ہندوستانی رومانویت کا تعلق وہاں کے مخصوص زرعی ومذہبی استحصالی نظام کے ساتھ رہا جب کہ یورپی رومانویت کا تعلق صنعتی نظام کے فروغ کے ساتھ وابستہ تھا۔رومانویوں کے ہاں ماورائیت کے باوجود اچھوتے،طاقتور،پرشکوہ،سرشاراورامیدافزاخیالات کی ترسیل کی جاتی رہی ہے مگر ہندوستان کے ترقی پسندوں کے ہاں سماجی ذمہ داریوں کے تصورات کے باوجود سماجی منزل کا تعین مفقود ہے۔

دنیا کی ابتدا سے لے کر موجودہ زمانے تک انسان مختلف ادوار سے گزر چکاہے۔ہردورمیں اس نے ترقی کی مختلف منازل طے کی ہیں۔مثال کے طور پر اگرہم زندگی کا ارتقائی حوالے سے جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلے گاکہ انسان نے سب سے پہلے جنگلی اور وحشی زندگی سے آغاز کیا۔پھر آہستہ آہستہ خانہ بدوشی کی زندگی کی طرف سفر کیا،پھر اس کے اندرقبائلی احساس پیدا ہوا، اُس نے بستیاں بسائیں،قصبوں اورشہروں کی بنیاد ڈالی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے نہ صرف زندگی کی ضروریات پیدا کیں بلکہ ایجادات،اختراعات اور مختلف علوم و فنون پردسترس حاصل کرلی۔اس طرح اس کی فہم وفراست اورقوتِ ادراک میں بے پناہ اضافے ہوئے۔تہذیب و ثقافت کا یہ قافلہ بڑھتارہا اور تاریخ بنتی رہی۔انسان کے عروج وزوال کے قصے،اس کی معاشی اورمعاشرتی ترقیاں،اس کےعلوم ومذاہب کے کارواں اوراس کی تہذیب وتمدن کی کہانیاں تاریخ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔اسی لیے زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک انسان نے جتنی ترقی کی منازل طے کی ہیں وہ ہمیں تاریخ نے ہی بتائی ہیں۔"ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مصداق انسان کی ارتقائی زندگی کودیکھیں تومعلوم ہوگا کہ انسان نے ہمیشہ مشکلات پر قابوپانے کی کوشش کی ہے اور وہ جیسے جیسے مسائل پر

قابو پاتا گیا وہ متمدن اورترقی یافتہ ہوتا گیا؛دیگر مخلوقات سے برتری ہی انسان کے متمدن ہونے کا باعث نہ تھی بلکہ گھمبیر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے، خندہ پیشانی اور حوصلے سے مشکلات پر قابو پانے نے انسان کو متمدن بنادیا۔مذہب نے انسانی زندگی میں تہذیب و تمدن، نظم وضبط،اصولوں،روایات وقوانین کی پاس داری،مال و جان کی حفاظت اورذمہ داری جیسی نمایاں صفات پیدا کرکے انسانوں کی اکثرت کو تہذیب یافتہ بنادیا۔ادب اورتہذیب و ثقافت کے مدارج کے متعلق پروفیسر عمر زبیری کی رائے ہے:

> "وادی نیل،وادیِ دجلہ،فرات اور وادی سندھ کی زرخیزی نے انسانوں کوتہذیب وثقافت کے ابتدائی مدارج سےروشناس کرایا اورپھران ہی وادیوں میں حکومتیں قائم کیں۔ میمفس، موہنجوداڑواوربابل جیسے شہر آباد کیے گئے۔ اہرام مصر کی حیرت انگیزتعمیرات بھی فنِ تحریر کی ایک ایجاد کا مقابلہ نہ کرسکیں اورانسان اپنا معلم آپ بن گیا کیوں کہ اس نے علوم و فنون ایجاد کیے اور قوانین بنائے۔"(۱۴)

قدیم ممالک میں مذہبی رجحانات کے ساتھ ساتھ فنِ تحریرکوبھی حیرت انگیزاورنہایت کارآمد طریقوں سے رائج کیا گیا۔ ابتدا میں تصویری رسم الخط ایجاد ہوا۔مختلف شکلیں اورتصویریں بناکرانسان اپنےخیالات کا اظہارکرنےلگا مثلاًبھوک کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو انسان کی ایسی تصویر بنائی جاتی جس کا ایک ہاتھ منہ پررکھا ہوتایا پھر اس کے سامنے ایک خالی پلیٹ کی تصویر بنا دی جاتی جس سے یہ ظاہرہوتا کہ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں،پھریہ تصویری رسم الخط مختصر ہوتے ہوتے نشانیوں تک محدود ہو گیا۔مصریوں نے اس تصویری تحریر کی ابتدا کی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ان نشانیوں نے حروف کی جگہ لے لی۔ان نشانیوں سے حروف اورحروفِ ابجد تک کا یہ تحریری ارتقائی سفر صدیوں پر محیط ہے۔فنِ تعمیر کے ایجاد ہونے کے ساتھ ساتھ کاغذ،قلم اورکالک کی روشنائی ایجاد کرکے مصریوں نے دنیاوی علوم کی داغ بیل ڈالی۔ان کی ضروریات، مشاہدات اور تجربات تحریرمیں آنے لگے۔فنِ تعمیرکی اہمیت اورارتقاکے متعلق اعجاز راہی کی رائے ہے:

> "بادشاہوں کے کارناموں کو اوردیوتاؤں کے قصیدوں کو کاغذ کے رول پر اور مندروں کی دیواروں پرلکھا جانے لگا تھا۔مصر کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر سامری، بابلی اور وادیِ سندھ کے لوگوں نے بھی ایجاد کرلیا اور جن وادیوں میں تہذیب و تمدن کی ترقی ہوئی ان میں فنِ تعمیر کی اہمیت بھی بڑھتی گئی۔"(۱۵)

فنِ تعمیر کے ایجاد ہونے کے بعد سومیریوں کی توجہ تعلیم کی طرف ہوگئی اور تعلیم کا انتظام

مندروں میں کیا جانے لگا۔ مندروں کے پروہت استاد بھی ہوتے تھے جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی سکھاتے تھے اس کے علاوہ گرائمر، حساب، حکمت اور جراحی کی بھی ابتدائی تعلیم رائج ہوگئی تھی۔ سومیریوں نے ان ہی علوم پر توجہ دی تھی جو روز مرہ زندگی میں کام آتے تھے۔

انسانی شعور عام معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کی رو میں بدلتا اور نئی راہوں پر گامزن ہوتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو ادب کا کام بھی یہی رہ جاتا ہے کہ وہ انسانی شعور کو وسیع تر کرے لیکن یہ نہ بھول جائے کہ انسانی شعور بیرونی تغیرات سے بدلتا ہے، محض کسی ادیب کے کہنے یا اظہار کرنے سے نہیں۔ انسانی شعور کو جلا بخشنے سے ادب تہذیب کی بقا اور ارتقا میں شریک ہو جاتا ہے۔ ادب ایک تہذیبی عمل ہے اور تہذیب کا کوئی ادارہ محض فرد کی کاوش کا مرہون منت نہیں ہے اس میں قوم کی زندگی کا دل دھڑکنا چاہیے۔ ہر دور میں قومی تہذیب وثقافت اور قومی زندگی ادب کو متاثر کرتی ہے لیکن اس کے انھیں حصوں کو پائیدار بنانے میں کامیاب ہوتی ہے جو اس وسیع تر نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں باقی حصے زیادہ سے زیادہ تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

قدیم تہذیب کے وہ اجزا جو انسان کی عظمت، زندگی کی بقا اور جدوجہد کے مظہر ہیں، کسی نہ کسی شکل میں نئی تہذیبی قدروں میں بھی جگہ پائیں گے۔ ان کے حاصل کرنے اوران پر زور دینے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ زندگی کے تسلسل کا پتہ دیں گے اور ایک قوم کو اس کے ماضی سے تعلق رکھنے میں بھی معاون ہوں گے اورزبان، ادب اور فنون لطیفہ اس تسلسل کو برقرار رکھنے میں بڑا حصہ لیں گے۔ تہذیب ایک ملک کے فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفیانہ خیالات، طرزِ معاشرت، مادی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بناکر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوش گوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ ادب اور تہذیب کے متعلق پروفیسر احتشام حسین کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> "ادب، تہذیبی ارتقا کا ایک جز اور اس کا ترجمان بن کر زندگی کی اس کش مکش کو پیش کرتا ہے جو کبھی فرد اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں رونما ہوتی ہے، کبھی جماعت اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں، اور ادب اس اظہار میں جس قدر زیادہ عمومی انداز اختیار کرتا یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زندگی کا ترجمان بنتا ہے اسی قدر وہ تہذیب کے عمومی پہلوؤں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔"(۱۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ اور ادب کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ایک مؤرخ نے خشک حقائق کو اس انداز سے پیش کرناہوتاہے کہ وہ حقائق قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں لیکن ہم یہ کہے

بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ واقعات و حقائق کو ادبی تاثرات پر کسی صورت میں بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ایسی ادبی کتابیں بھی ملیں گی جنھیں پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے اس زمانے کی تہذیبی تاریخ کی ایک جھلک گھوم جاتی ہے، ان کتابوں میں توبتہ النصوح، فسانۂ آزاد، فسانۂ مبتلا وغیرہ کے نام آسانی سے لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے دہلوی اور لکھنوی تاریخ و تہذیب کی ایک جھلک ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ منظوم تاریخ بھی لکھی گئی۔ تاریخ جن واقعات کو بیان کرتی ہے فن کار ان کی رنگین تصویر کھینچ دیتاہے۔ اس لحاظ سے تاریخ اور ادب کا رشتہ خاصا پرانا ہے کیوں کہ سائنس سے دریافت شدہ حقائق کو ادبی رنگ میں پیش کرنا ضروری ہے۔

تاریخ کے اوراق ان واقعات کے مظہر ہیں کہ ارسطو کے زمانہ میں تاریخ ادب کا ایک حصہ بن گئی اور پھر یہ سلسلہ انیسویں صدی تک جاری رہا۔ ادبی دُنیا کے ہیرو مبالغہ آرائی سے کام لیتے رہے اور تاریخ میں تحقیق کے پہلو کا فقدان رہا۔ ایسی تاریخ کے متعلق لوگوں کے نظریات کا مختلف ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن تاریخی حقائق کو محض ادبی رنگ آمیزی پر قربان کردینا کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ ادب نام ہے اظہاروبیان کی بلندیوں کا نہ کہ پھوہڑ پن کا، ادب نام ہے انسان اور فطرت اور خود انسان اور انسان کے درمیان مغائرت ختم کرنے کے لیے خوبصورت مساواتوں کی تخلیق کا، ادب نام ہے آدمی کی منزل تک ارتقائی سفر اختیار کرنے کا تا کہ جب ثقافت اپنی ترقی اور تبدل کا فنی گراف بڑھانا چاہے تو ادب سماجی مؤرخ کا ہا تھ بٹا ئے۔ اگر یو ں کہا جائے کہ تاریخ انسان کے ان کارہائے نمایاں کی داستان ہے جو اس نے معاشرے میں رہتے ہوئے سرانجام دیئے ہوں تو گویا انسان کا ہروہ عمل جو اس نے مہذب معاشرہ میں رہ کر سر انجام دیاہے تہذیب و ثقافت کی روح ہے تو اس طرح تہذیب و ثقافت، ادب اور انسان ایک ایسی مثلث کی مانند ہیں جن کے تینوں زاویوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے تواس طرح انسان دلچسپ واقعات بیان کرے گا تووہ ادب ہو گا اور اگر حقائق کی گتھیاں سلجھائے گا تو تاریخ بنتی چلی جائے گی اور یوں زندگی کا سفر اور ارتقا ہی تہذیب و ثقافت کہلائے گا۔

تہذیب و ثقافت کی تلاش کا سفر دراصل انسانی وجود کوجاننے اور سمجھنے کا ہی عمل ہے۔ انسانی شخصیت کے اتارچڑھاؤ، جذباتی مدوجزر کے علاوہ تاریخیں اور تہذیبیں کس طرح جنم لیتی ہیں؟ یہ سوال آج بھی اہلِ بصیرت کو دعوت فکر دے رہاہے۔ کوئی بھی تہذیب اور ثقافت محض چند دنوں میں جنم نہیں لے سکتی یہ ہزاروں نہیں بل کہ لاکھوں سالوں پر محیط انسانی کار گزاریوں کا سفر دکھائی دیتاہے اور انسانی زندگی پر مشتمل صدیوں کا یہ سفر کچھ قواعد و ضوابط و ضع کرنے کا سبب بنتا ہے اور یہی قواعدوضوابط تہذیب و ثقافت

کا حصہ بن جایا کرتے ہیں۔ گم شدہ زمانوں اور کہنہ آبادیوں کی دریافت جن کا تعلق ہماری تہذیبی و ثقافتی تاریخ سے ہے اور انھیں وقت نے کس طرح شکست و ریخت سے دو چار کر کے تباہ و برباد کر دیا ہے یہی مطالعہ ہمارا مقصود و محور ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ ول ڈیوراں، مترجم: تنویر جہاں، انسانی تہذیب کا ارتقا، (حصہ: اول) لاہور: مکتبہ فکر و دانش، ۱۹۸۹ء، ص:۷۸

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۷ء، ص:۴۱، ۴۲

۳۔ رابرٹ بریفالٹ (عبدالمجید سالک)، تشکیل انسانیت لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص:۱۳۶

۴۔ جعفر ندوی، مقالات، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۶۷ء، ص: ۲۴۵

۵۔ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۵ء، ص: ۶۲

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مترجم)، برّصغیر میں اسلامی کلچر، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۲۱

۷۔ صباح الدین عبدالرحمن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، لاہور: روہتاس بکس، س ن، ص:۳۷۶

۸۔ قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص:۱۲۶

۹۔ شہزاد حسین (مرتّبہ)، افسانے، لاہور: نذر سنز، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۸۶

۱۰۔ Edward Michael,British in India,London,۱۹۶۷,P: ۳

۱۱۔ شمیم احمد، ناول نگاری کا غالب رجحان۔ تخلیقی ادب، جلد:۲، کراچی: مینا پریس، ۱۹۸۰ء، ص: ۳۲

۱۲۔ قرۃ العین حیدر، چاندنی بیگم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص:۱۵

۱۳۔ قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص:۸۶

۱۴۔ عمر زبیری، پروفیسر، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، لاہور: دارالشعور، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۰

۱۵۔ اعجاز راہی، تاریخ خطاطی، راول پنڈی: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۶ء، ص: ۸۳

۱۶۔ احتشام حسین، ادب اور کلچر، مشمولہ: کلچر از اشتیاق احمد، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء، ص:۱۵۹